ARMAGHAN (ارمغان)

Volume 2, 2021

ISSN (Print): 2707-6288 | ISSN (Online): 2788-8255

http://armaghan.wum.edu.pk

آصف فرخی کے افسانوں کا تکنیکی مطالعہ

رخسانہ پروین

Abstract

Asif Farrukhi, an enormously prolific, creative, genius, occupies a significant position among the short story writers who made their debut in the 1970s. The 20th Century literature exhibited the use of unique themes and the employment of numerous techniques by the literary artists of craftsmen. Asif Farrukhi is an inseparable part of that constellation of literary figures who apart from writing on variety of themes, employed multi techniques as well. Uniqueness of themes, freshness of style and skillful use of the creative techniques are some of the specialties which give Asif Farrukhi a prominent niche among the contemporary Urdu short story writers.

اردو فکشن کی ساتویں دہائی میں آصف فرخی کا نام قابل ذکر ہے آصف فرخی جنہوں نے اپنی فکر کی جاگیر سے نت نئے الفاظ اردو افسانے کو عطا کئے اور پھر ان الفاظ کو معنویت کا ایک نیا جہان دیا۔ آصف فرخی کے افسانے محض تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ ان کی بنیاد حقیقت اور مشاہدے پر مبنی ہے جسے وہ اپنے منفرد اسلوب اور تکنیکوں کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ زاویہ حیات اور سیاست کی سمت تبدیل ہونے سے لا محالہ طور پر افسانے کی ہیت اور تکنیک میں بھی تبدیلی آئی۔ آصف فرخی نے اس ساری صورتحال کے اظہار کو نت نئے اسلوب اور تکنیک کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا۔ آصف فرخی کے ہاں موضوعاتی صداقت کا بیان ہو یا سماجی واقعات کا، وہ تاریخ' اساطیر، مذہبی قصص اور تلمیحات کا سرا عہد حاضر کے ساتھ اس طرح جوڑتے ہیں کہ شعور کی آگہی کے نئے دریچے بھی وا ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان میں خاص قسم کی معنویت بھی پیدا ہو جاتی ہے جو عہد جدید کے حقائق کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ اظہار کے ان نت نئے وسیلوں نے آصف فرخی کو ان افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا جنہوں نے اپنے فکری، فنی، اسلوبیاتی اور تکنیکی رویوں سے اردو افسانے کو نت نئے ذائقوں سے آشنا کیا۔

مختصر افسانہ دور جدید کی پیداوار ہے صنعتی انقلاب نے معاشرے میں جو تبدیلیاں اور پیچیدگیاں پیدا کیں اس سے زندگی کے مسائل میں گوناگوں اضافہ ہوا مسائل کے تنوع نے جب انسان کو عدیم الفرصت بنایا تو اس نے مختصر افسانے میں پناہ ڈھونڈی تاکہ وہ مختصر ادب پارے کو پڑھ کر ذہنی آسودگی حاصل کر سکے۔

بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ انسانی سوچ اور فکر کے لئے انتہائی اہم موڑ ثابت ہوا۔ ذہنوں میں جو انقلاب برپا ہوا اس نے سوچنے کے نئے در وا کئے نت نئے موضوعات سامنے آئے اور ان موضوعات کو بیان کرنے کے لئے طریقہ کار میں جدت کو اپنایا گیا۔ معمولی سے معمولی واقعہ بھی اس قدر اہم تھا کہ انسانی ذہن نے اسے افسانے کا ایک مکمل موضوع بنا دیا۔ رفتہ رفتہ جب موضوعات میں رنگا رنگی ہوئی تو فن کے نئے نئے اسالیب بھی سامنے آنے لگے جہاں موضوعات میں تنوع پیدا ہوا تو وہاں تکنیک کی بھی متنوع جہات سامنے آئیں۔ افسانہ نگار کو زندگی کے نت نئے مسائل کے اظہار کے لئے مختلف پیمانوں کی ضرورت پڑی یہی پیمانے نت نئی تکنیکوں کی صورت میں سامنے آئے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ افسانے کے مضامین غیب سے خیال میں نہیں آتے بلکہ اس کا تعلق ہماری مادی زندگی سے ہے ہاں البتہ حقیقت کے ساتھ تخیل کا اتصال ہوتا ہے اور افسانہ وجود میں آتا ہے۔ افسانہ نگار اس تاثر کو پورے خدوخال کے ساتھ پیش کرتا ہے اور زندگی کی پہچان کرواتا ہے اور اس کے بیان کے لئے وہ کچھ اجزائے ترکیبی کا سہارا بھی لیتا ہے اور پھر اسے منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

افسانہ نگار زیست سے فکری زاویے لیتا ہے اور اسے موضوع بنا کر الفاظ اور زبان کے پیرائے کو اظہار کے لیے استعمال میں لاتا ہے۔ فن پارے کو متحرک بنانے کے لئے اپنے اسلوب میں کردار، جذبات، منظر اور دیگر فنی وسائل کو شامل کر کے اور پھر موضوع کو اسلوب سے ہم آہنگ کرنے کے بعد اسے تکنیک کے ذریعے ایک شکل دے کر اس سے ایک تصویر بنا دیتا ہے اور یہ تصویر ہمیں اپنی آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔

آغاز میں افسانہ یک سطحی اور اکہرا تھا افسانہ نگار موضوع کو بیان کرنے کے لئے بیانیے سے کام لیتا تھا کچھ عرصہ بعد بے رحم حقیقت نگاری کا سلسلہ شروع ہوا تو تکنیک کے ساتھ مختلف رجحانات نے بھی اظہار کا وسیلہ بننا شروع کر دیا اس دور کے افسانہ نگاروں نے ایک ماہر نباض کی طرح معاشرے میں پائی جانے والی بیماریوں کی تشخیص کی اور اسے افسانے میں بیان کیا۔

اردو افسانہ جب بیسویں صدی کا نصف مکمل کر چکا تو اسے بہت سے ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جس کا اظہار عام بیانیے کی صورت میں نہ ہو سکا تھا اسے اپنی ذہنی کشمکش، آرزو کے اظہار اور ذات کے تزکیہ کے لیے علامت نگاری، تلازمہ خیال، شعور کی رو، خود کلامی، ڈرامائی تکنیک، ہجوم کی تکنیک، خط کی تکنیک، اظہاریت، ماوراء حقیقت، تصوریت، وجودیت اور تجریدیت جیسے رجحانات اور تکنیکوں کو استعمال کرنا پڑا جس نے بڑی سرعت کے ساتھ افسانے کی روایت کو جدت عطا کی اسی تناظر میں بات کرتے ہوئے ڈاکٹر عقیلہ جاوید لکھتی ہیں۔

"جب افسانہ نگار خارجی حقیقت نگاری سے باطنی حقیقت نگاری کی طرف آیا تو لا محالہ تکنیک اور ہیت میں تبدیلی لانا پڑی اور وسیلہ اظہار کے نئے تجربات سے گزرنا پڑا"(1)

ستر کی دہائی میں جدید افسانے کے منظر نامے پر ابھرنے والے ناموں میں سے ایک نام آصف فرخی * کا بھی ہے جو اپنا منفرد انداز لے کر سامنے آئے۔ آصف فرخی کے افسانوں میں تہذیبی اور سماجی تجربوں کی ایک دنیا آباد ہے جسے دکھانے کے لیے وہ کبھی علامتی راستوں سے گزرتے ہیں کیونکہ بسا اوقات ان کے افسانوں میں بیک وقت دو کہانیاں، ایک افسانے کے اندر اور ایک باہر چل رہی ہوتی ہے۔ علامتوں کے نت نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔

آصف فرخی نے اپنے افسانوں میں مختلف النوع تکنیکیں استعمال کی ہیں مثلاً بیانیہ، ڈرامائی، شعور کی رو، ہجوم کی تکنیک، علامت نگار، واحد متکلم، منظر نگاری اور سہ بعدی (Three Dimensional) تکنیک مگر اس تمام تر جدت کے باوجود کسی بھی موڑ پر اپنی روایت سے رشتہ نہیں توڑتے بلکہ ان تکنیکوں کو کامیابی کے ساتھ اپنے افسانوں میں اپناتے ہیں۔

آصف فرخی کے بیشتر افسانوں میں بیانیہ انداز ہے اور یہ انداز موضوع اور فکر کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ان کے اکثر افسانوں کا آغاز یا تمہید بہت خوب صورت ہوتی ہے افسانوں کے آغاز میں ڈرامائی عنصر موجود ہوتا ہے اور پھر بیانیہ کے ذریعے واقعات آہستہ آہستہ سامنے آتے جاتے ہیں اور قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔

نفسیاتی الجھنوں کو پیش کرتا ہوا افسانہ "من شر ما خلق" میں شدت تاثر موجود ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذاتی المیہ پھیل کر کہانی کی صورت میں ڈھل گیا ہے افسانے میں حقیقت کی ٹھوس سطح ہے ایک عورت کا بار بار اسقاط حمل سے گزرنا مختلف اندیشوں اور وسوسوں کا شکار ہونا اور نہ چاہتے ہوئے بھی مرد کے ازدواجی تعلق کو برداشت کرنا یہ وہ تمام صورتیں ہیں جو بڑی فنی مہارت سے آصف فرخی نے پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد اس افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے اور داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں

"من شر ما خلق" کو میں ممتاز شیریں کے "کفارہ" کے بعد بہت اہم افسانہ خیال کرتا ہوں"(2)

کہانی ڈرامائی انداز میں شروع ہوتی ہے

"دہلیز خون سے سرخ تھی"(3)

اس ڈرامائی عنصر کے بعد قاری کے تجسس میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ بیانیے سے کام لے کر واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کہیں بھی سپاٹ پن محسوس نہیں ہوتا بلکہ محسوسات، جذبات کا عنصر نمایاں ہی رہتا ہے۔ اسی طرح ان کے مختلف افسانوں کے آغاز میں ڈرامائی عنصر موجود ہے۔

"اس مکان میں کچھ تھا"(4)

"وہ اڑتا ہوا آیا اور گاڑی کی ونڈ سکرین سے ٹکرا گیا"(5)

"پرندے بالکل ساکت تھے"(6)

"وہ کونے میں کھڑا تھا دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر"(7)

افسانے کے نہ صرف آغاز میں بلکہ اندر بیانیے میں بھی واقعات محض واقعات کے طور پر پیش نہیں ہوتے بلکہ افسانوں کے موضوعات حقیقی اور تکنیک بیانیہ ہونے کے باوجود اس میں ذومعنویت قائم رہتی ہے۔

"میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی میرے سوال کا جواب کہیں بھی نہیں تھا اپنے اوپر بند
ہو جانے والے دروازے کے سامنے بیٹھے رہنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں میں اس دروازے
کے سامنے پورچ میں کھڑا ہو گیا میں نے اپنے دونوں بازو پنکھ کی طرح پھیلا دیے اور

گہرے گہرے سانس بھرنے لگا جب تک پنجرہ میری تلاش میں مجھ تک دوبارہ پہنچ نہیں
جاتا"(8)

آصف فرخی کے ہاں ایک انداز بیان یہ بھی ہے کہ واقعات کو خود بیان کرتے چلے جاتے ہیں جس سے قاری کو واقعے کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم ہوتی چلی جاتی ہیں کرداروں کے طرز عمل پر روشنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ ماحول یا ارد گرد کے بارے میں بیان کرنے کی بجائے ان واقعات کو بھی بیان کر دیتے ہیں جو خود ان کی زندگی میں رونما ہوئے۔ اس طرح وہ صیغہ واحد متکلم یا آپ بیتی کی تکنیک کو اپناتے ہیں۔ اپنی اس تکنیک کی بدولت زندگی کی بہت سے پہلو جو معمولی سمجھ کر احاطہ ادب میں نہیں آتے تھے۔ آصف فرخی نے اسے ادب کے دامن میں سمیٹا مثلاً کراچی شہر سے گزرتے ہوئے وہاں کی سڑکوں اور ٹریفک کا حال بھی اس طرح سے بتاتے جاتے ہیں کہ وہاں کی زندگی کا عکس افسانوں میں جھلکنے لگتا ہے۔

"میں نے چونک کر دیکھا میں نے پھر اس دیکھے بھالے موڑ کو مس کر دیا۔۔۔۔۔۔۔ میں سگنل پر رکتا ہوا مائی کولاچی برج پر چلا جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الٹے ہاتھ پر دکانیں اور سیدھے ہاتھ پر فلیٹوں کا سلسلہ پیچھے رہ گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر اب یہ پانی ٹھہرا ہوا تھا اور دھول بھرے حصے پر مختلف تعمیراتی کمپنیوں کے بورڈ لگے ہوئے تھے"(9)

"شہر بیتی" اور شہر ماجرا" کے بیشتر افسانے اور خصوصیت کے ساتھ "پرندے کی فریاد"، "بونسائی"، سمندر کی بیماری"، "آج کا مرنا"، "مرنا اگر ایک بار ہوتا" اور کھجور کا درخت" (میرے دن گزر رہے ہیں) میں واحد متکلم اور خود کلامی کا عنصر کسی نہ کسی تناسب میں جو فرد کی داخلی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی خارجی صورتحال کو بھی بھرپور طریقے سے پیش کرتا ہے۔

آصف فرخی جہاں صیغہ واحد متکلم سے ماحول کی تصویر کشی کرتے ہیں وہاں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ صیغہ غائب سے بھی افسانے میں موثر انداز پیدا کرتے ہیں اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس ماحول کی عکاسی "وہ" کی بجائے "میں" میں کی گئی ہوتی تو اس قدر دلکش نہ ہوتی۔ آصف فرخی کے افسانوں میں ایک تکنیک "ہجوم کی گفتگو" کی بھی ہے جس میں کسی اہم واقعے یا منظر پر ہجوم اکٹھا ہوتا ہے اس ہجوم میں طرح طرح کے لوگ جمع ہیں۔ ہر ایک اپنی طرز کی بات کرتا ہے۔ ایک طرف سے ایک آواز آتی ہے تو دوسری طرف سے اس سے الگ توجیہہ بیان کی گئی ہے۔ افسانہ "سمندر کی چوری" مشمولہ (میرے دن گزر رہے ہیں) میں ایک مختلف کیفیت کو بیان کرتے ہیں۔ آصف فرخی کے اس شاندار افسانے کی دوبار ڈرامائی ریڈنگ ہو چکی ہے۔ ہندی اور جرمن زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اسے انتظار حسین نے جادوئی حقیقت نگاری کا نام دیا ہے۔(10)

یہاں جو منظر پیش کیا گیا ہے اس میں شہر والے صبح جاگے تو دیکھا کہ سمندر غائب ہو چکا ہے اور لمحہ بھر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ مجمع اکٹھا ہو گیا اب جتنے منہ اتنی باتیں افسانے کا کردار "ہجوم" بن جاتا ہے اور سب لوگوں کی باتیں ایک واقعے کے متعلق ہیں۔

ان کا افسانہ "جشن مرگ انبوہ" مشمولہ (اسم اعظم کی تلاش) میں اہلیان شہر صبح دیکھتے ہیں کہ ان کے مشاہیر کے مجسمے ٹوٹے پڑے ہیں اب لوگوں کے درمیان مختلف خیال آرائیاں ہونے لگتی ہیں یہاں بھی افسانے کا کردار "ہجوم" ہے اس واقعے پر ہر شخص اپنی تاویل پیش کرتا ہے اسی طرح افسانے کی یہ تکنیک اس میں جدت کے ساتھ ساتھ اسے موثر بناتی ہے۔

آصف فرخی کے ہاں منظر نگاری کی تکنیک کا حوالہ بھی نظر آتا ہے ان کا افسانہ "رات کی رانی" مشمولہ (آتش فشاں پر کھلے گلاب) منظر نگاری کی خوبصورت مثال ہے اس افسانے میں باقاعدہ کوئی واقعہ ہمارے سامنے نہیں آتا۔ صرف مناظر کے بیان سے ہی کچھ واقعات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں آصف فرخی نے جو سماں باندھا ہے وہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شاعر اپنی شاعرانہ زبان میں کسی منظر کی تصویر کشی کر رہا ہے۔

سہہ بعدی تکنیک وہ تکنیک ہے جس میں افسانہ نگار ایک واقعے کو لے کر انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے اور آصف فرخی نے اپنے افسانے "السلام علیکم یا اھل القبور" مشمولہ (میں شاخ سے کیوں ٹوٹا) میں اس تکنیک کو بڑی خوبصورتی سے برتا ہے افسانے کا مرکزی خیال "مٹی" یا "زمین" سے ہے اور پھر افسانہ نگار "زمین" پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتا ہے زمین کا ایک پہلو یہ ہے کہ جب انسان مرتا ہے تو اسے زمین کی ضرورت ہے۔ زندگی میں رہائش کے لئے زمین کی ضرورت ہے زمین کا تیسرا پہلو غاصبانہ قبضے ہیں۔ یہاں تک کہ قبرستانوں کی زمین بھی اس سے محفوظ نہیں اس کے علاوہ کراچی جیسے صنعتی شہر میں جہاں کی مٹی جڑیں نہیں پکڑتی اس زمین پر رہنے والے کس حد تک بے حس ہو چکے ہیں یہ انسانی زندگی کے وہ مختلف پہلو ہیں جنہیں افسانہ نگار نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

آصف فرخی کا افسانہ "سمندر" مشمولہ (چیزیں اور لوگ) اسی تکنیک پر لکھا جانے والا افسانہ ہے یہاں تین زمانوں کی صورتحال کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار ایک "کچھوی" کے انڈے دینے کے واقعہ کو لے کر زمانہ ماضی میں بھی زقند لگاتا ہے۔ زمانہ حال کو بھی پیش کرتا ہے اور مستقبل پر بھی نظر رکھتا ہے۔ آصف فرخی نے اس تمام صورتحال کو اس طرح بیان کیا کہ ہم باری باری ان زمانوں میں پہنچتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

یہ تمام تکنیکیں ہیں جو اردو افسانے کی ابتداء میں استعمال کی جاتی تھیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ افسانے میں نت نئی تکنیک، رجحانات اور تحریکوں نے افسانے کی پرانی بندشوں کو توڑ دیا ان بندشوں کے ٹوٹنے سے افسانے، نے زندگی کی تمام تر پیچیدگیوں کو اپنے موضوعات کا حصہ بنانا شروع کر دیا۔ افسانے کے آغاز میں کچھ وحدتوں کے تاثر کو افسانے کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا لیکن آنے والے وقت میں زمان و مکان کی وحدت کی وہ اہمیت نہ رہی جو ابتداء میں اسے حاصل تھی۔ ادب میں داخل ہونے والے نت نئے نظریات جن میں نفسیات کے نظریات کے گہرے اثرات ادب پر مرتب ہوئے جو کچھ عرصہ بعد "شعور کی رو" کی اصطلاح میں سامنے آئے۔ جس نے بعد میں ایک تکنیک کی شکل اختیار کی۔

آصف فرخی کا افسانہ "حرام مغز" مشمولہ (اسم اعظم کی تلاش) میں "شعور کی رو" کی تکنیک استعمال کی گئی ہے اس افسانے میں افسانہ نگار کے خیالات بجلی کی طرح کوندتے نظر آتے ہیں لیکن ایسا نہیں کہ ان بے ربط خیالوں میں تسلسل نہ ہو ایک خیال اور دوسرے خیال کی کڑی

کہیں نہ کہیں جا کر مل جاتی ہے۔ اس افسانے میں زمانے کی قید نہیں اس لیے وقت کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے مگر دونوں واقعات کا سرا عصر حاضر سے مل جاتا ہے۔

افسانہ "شرم الشیخ" مشمولہ (آتش فشاں پر کھلے گلاب) بھی "شعور کی رو" کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ یہاں صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں طے ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کردار زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ بس خیالات کا بہاو جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ نگار کا ذہن انسانی زندگی کے مختلف پہلوں کا تاریخی شعور رکھتا ہے۔ جدید دنیا کی زندگی جس تیزی سے کروٹیں بدل رہی ہے یہ افسانہ اس زندگی کا عکاس ہے۔

۱۹۶۰ء کا عشرہ افسانے کے لئے نئے رخ اور نئے زاویے لایا جدیدیت کے ساتھ ساتھ سیاسی سماجی جبر نے بھی اردو افسانے میں علامت نگاری کو رائج کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں آنے والے افسانہ نگاروں نے بھی روایت سے انحراف نہیں بلکہ اس میں مزید اضافہ کیا۔ جدید تر نسل کے وہ افسانہ نگار جنہوں نے علامتی افسانے لکھے اور اس کے ذریعے افسانوں کو نیا روپ دیا ان میں آصف فرخی بھی ایک ایسا نام ہے جس نے علامت کو تخلیقی انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ آصف فرخی نے علامتی انداز میں بعض نہایت عمدہ اور خوبصورت افسانے تخلیق کیے۔ آصف فرخی کے ہاں علامتی افسانوں کی بنیاد داستان، مذہبی قصے، تلمیح اساطیر یا حکایات پر ہے۔ آصف فرخی نے ان تمام چیزوں کے پس منظر میں یا ان کے تناظر میں حال کی زندگی کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کے افسانے "اصحاب کہف"، "حکایت نیند سے واپس آنے والوں کی"، "اسطورہ"، "حکایت مشکوۃ"، "پیچھے دیکھا اور پتھر"، "کوفے کا شہری"، "باب خروج" مشمولہ (اسم اعظم کی تلاش)، "آتش فشاں پر ناچنے والا چوہا" اور "ناقتہ اللہ" مشمولہ (آتش فشاں پر کھلے گلاب) کے عنوان ہی علامتی ہیں۔ ان کو علامت بنا کر فرد کی زندگی اور سماج میں موجود مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے۔

آصف فرخی کے ہاں علامت نگاری میں بھی تنوع موجود ہے وہ علامت صرف مذہبی یا تہذیبی پس منظر سے نہیں لیتے بلکہ عام زندگی سے بھی علامتیں اخذ کرتے ہیں ان علامتوں میں ایک واضح اشارہ موجود ہوتا ہے جس تک قاری کی پہنچ آسان ہوتی ہے۔ یہ افسانے ان کے گہرے مشاہدے کا بھی ثبوت ہیں ان میں "سمندر کی بیماری" اور "کہر" مشمولہ (میرے دن گزر رہے ہیں)۔ "دیمک" مشمولہ (چیزیں اور لوگ) میں معاشرے میں پھیلی افراتفری، منافقت سیاسی و سماجی صورت حال پر علامتی زبان میں بات کی گئی ہے یہ علامتیں ملکی صورت حال کے حوالے سے گہری تشکیک کے زاویے ابھارتی ہیں۔

آصف فرخی ایک تاثراتی افسانہ نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کے افسانے "باب خروج"، "بھنور کی آنکھ"، "شہر کتاب خوار" مشمولہ (اسم اعظم کی تلاش) اور "آتش فشاں پر ناچنے والا چوہا" میں محض ایک تاثر پیش کیا گیا۔ آصف فرخی کے یہ افسانے مختصر ہیں۔ یہ افسانے جہاں ان کی انفرادیت کم گوئی کو سامنے لاتے ہیں وہاں اس بات کا بھی اظہار کیا کہ آصف فرخی ایک مشکل پسند افسانہ نگار ہیں۔

آصف فرخی بنیادی طور پر ایک علامتی افسانہ نگار ہیں انہوں نے اپنے افسانوں میں علامت کو اظہار کا وسیلہ بنایا اور ان علامتوں سے عصر حاضر کو بڑی خوبی سے پیش کیا۔ ان کے ہاں کہانی علامتی ہونے کے باوجود مربوط ہوتی ہے اس میں باقاعدہ صورت گری موجود ہے جو عصری

تقاضوں کی وجہ سے ان افسانوں میں ابھرتی ہے۔ علامت سازی کا اعلیٰ ہنر ان کے افسانوں میں اجاگر ہوتا ہے داخلی شکست وریخت، گھٹن، سیاسی، سماجی جبر، انسانی واخلاقی اقدار کی پامالی اور خاص طور پر کراچی کی صورتحال کے حوالے سے انہوں نے جن سچائیوں کا اظہار کیا وہ انہی کا خاصہ ہے۔

آصف فرخی کے ہاں جہاں موضوعات کی وسعت ہے وہاں ان کی تکنیک میں بھی گہری رمزیت سامنے آتی ہے بیان میں سادگی مگر تہہ داری ہے علامت استعمال کرتے ہوئے سیدھا سادا بیانیہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں تازگی اور فنی ندرت موجود ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ان کے افسانے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "۸۰ سے ۹۰ کے درمیان نمایاں ہونے والے افسانہ نگاروں میں آصف فرخی کا نام اہم ہے۔ وہ اپنے افسانے "دیمک" سے پہچانے گئے جس میں علامت نگاری ہے۔۔۔۔۔۔ ان کے افسانے منظری ہوتے ہیں جس میں بیانیہ کا خاص رول ہوتا ہے"(11)

آصف فرخی کے افسانے اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے اپنے متحرک ذہن، جستجو اور لگن کی بدولت اردو افسانے میں جس اسلوب اور تکنیک کا استعمال کیا اس نے انہیں انفرادیت عطا کی۔ قدیم داستانوں، تمثیلوں، حکایتوں اور تلمیحات کو جدید اظہاری رویوں میں ڈھال کر، سیاسی، معاشی اور سماجی موضوعات کو ایک پرانے داستان گو کی طرح جس انداز میں بیان کیا اس نے اردو افسانے میں آصف فرخی کا واضح مقام متعین کر دیا بلاشبہ وہ انتظار حسین کی روایت کا وہ جدید احساس تھے جن کے ہاں روایت کی تخلیقی سطح پر بازیافت تو ہے مگر منظر نامہ نیا ہے۔ انتظار حسین کا خیال ہے کہ:

> "افسانوں کے اندر اسلوب ان کا نیا ہے ان کے ہاں بالکل نئے طریقے سے زبان کا استعمال ہوا ہے اس کو بھی برتا جو انہوں نے مغربی فکشن سے سیکھا۔۔۔۔۔۔ ان کا وژن بہت وسیع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں معنویت زیادہ ہوتی ہے اور تکنیک کو مہارت سے استعمال کرتے ہیں وہ محض تقلید نہیں کرتے بلکہ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں اس لیے ان کے افسانے میں معنویت اور گہرائی ہوتی ہے اور یہی چیز ان کا ادبی مقام بھی متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔"(12)

بلاشبہ آصف فرخی جس وسیع فکری افق کے حامل تھے اگر وہ زندہ رہتے تو یقیناً ان کا رخ مزید نئی جہات کی طرف ہوتا۔ بہر طور اب بھی وہ اردو افسانے کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

1۔ عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، "جدید اردو افسانے میں عورت کی آواز" مشمولہ، روشنائی، (کراچی: جلد ۱، شمارہ ۳۸، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۹ء)، ص ۳۹

* آصف فرخی ڈپٹی نذیر احمد کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد اسلم فرخی ادب میں نمایاں مقام کے حامل ہیں ان کی والدہ تاج بیگم شاہد احمد دہلوی کی بھتیجی ہیں۔ آصف فرخی ادب جن کی گھٹی میں تھا'۱۶' ستمبر ۱۹۵۹ء کو کراچی میں پیدا ہوئے ڈاؤ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا اور ڈاکٹری کے پیشے سے منسلک ہوئے عصمت چغتائی کے سمجھانے پر ادب کو محبوبہ بنایا اور تمام عمر اس کی محبت کا دم بھرتے رہے۔ آٹھ افسانوی مجموعے، ایک نظموں کا مجموعہ اور کئی کتب کے مترجم اور "دنیازاد" کے مدیر رہے۔ انہوں نے یکم جون ۲۰۲۰ء کو کراچی میں وفات پائی۔

2۔ انوار احمد ڈاکٹر، اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء) ص ۵۳۵

3۔ آصف فرخی، "من شر ما خلق" مشمولہ، چیزیں اور لوگ (کراچی: اجسن مطبوعات، ۱۹۹۹ء)، ص ۹۷

4۔ آصف فرخی، "دیمک" مشمولہ، چیزیں اور لوگ، ص ۲۹

5۔ آصف فرخی، "کاگ داس" مشمولہ، چیزیں اور لوگ، ص ۸۳

6۔ آصف فرخی، "پرندے کی فریاد" مشمولہ، میرے دن گزر رہے ہیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء) ص ۷

7۔ آصف فرخی، "جو کہتا ہے وہی ہوتا ہے" مشمولہ، میرے دن گزر رہے ہیں" ص ۱۸۶

8۔ آصف فرخی، "پرندے کی فریاد" مشمولہ، میرے دن گزر رہے ہیں ص ۱۵

9۔ آصف فرخی، "مائی کولاچی" مشمولہ، میرے دن گزر رہے ہیں ص ۱۸۴

10۔ انتظار حسین، انٹرویو، رخسانہ پروین (لاہور: ۱۸ جون ۲۰۱۴ء)

11۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۸ء)،

12۔ انتظار حسین، انٹرویو، رخسانہ پروین (لاہور: ۱۸ جون ۲۰۱۴)